ادبیات سے تغافل برتنا زیبا نہیں

(نیومین)

# مقالات نیومین

از

مولوی محمد سلیمان صاحب بی، ایل کشن گنج

باہتمام محبوب الرحمن مطبوعہ جہانگیر پریس کشن گنج، پورنیہ

قیمت ۵ر

# فہرست مضامین

| نمبر شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|

# دیباچہ

انگریزی کے نثر نگاروں میں کٹر مذہب پرست
کارڈینل نیومین کا بھی پایہ بہت بلند ہے انکے ادبی مقالات
کا انتخاب پٹنہ یونیورسٹی کے بی، اے کے نصاب میں داخل
تھا۔ نیومین کی پیدائش کا سال سنہ ۱۸۰۱ اور وفات کا سال سنہ ۱۸۹۰ ہے۔
بی اے میں پڑھتے ہوئے میں نیومین سے روشناس ہوا
مجھے اسی وقت یہ خیال ہوا تھا کہ اگر نیومین کے ادبی مقالے
اردو میں آجائیں تو ایک قیمتی اضافہ ہو۔
میرا وہ خیال قائم رہا اور میں نے کبھی کبھی اسکی کوشش کی
کہ نیومین کے خیالات کو اردو میں ادا کردوں۔ ان چند صفحوں میں

جو مقالات پیش کئے جاتے ہیں وہ نیومین کے محض چند مقالات سے ماخوذ ہیں اور وہ بھی بالکلیہ نہیں۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں ہاں اتنا جانتا ہوں کہ نیومین کے لئے مجھ سے بہتر ترجمان کی ضرورت ہے۔

یہ مقالے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں، شریف النفس زمانہ کانپور میں، لٹریچر عدیم گیا ہیں، یونیورسٹی خیام لاہور میں اور دوسرے مقالے مقامی اخبار آئینہ میں شائع ہوئے تھے، اب انہیں مقالات کو جمع کرکے چھوٹی سی کتاب کی صورت دے دی جاتی ہے۔

محترم مدیر خیام نے "یونیورسٹی" کو "معلومات آفریں" لکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیومین کے سارے مقالات ہی معلومات افزا ہیں۔ چونکہ یہ مقالات آسان نہیں ہیں ضرورت ہے کہ غور و فکر سے پڑھے جائیں۔ اگر میری اس کوشش سے گنتی کے چند اصحاب کے بھی معلومات میں اضافہ ہو جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ "کارے کردم"۔

کاشانہ۔ گشن گنج
۱۳ر جولائی ۱۹۴۱ء

محمد سلیمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# علم - علم کے لئے

## علم اپنی غایت آپ ہے

علم میں بذات خود یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی غایت آپ ہوسکے انسانی دماغ کی بناوٹ کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ کسیطرح کا بھی علم جو درحقیقت صحیح معنوں میں علم ہو اسکے لئے اپنا صلہ آپ ہے ۔ دولت، ثروت، عزت یا زندگی کی دیگر آسائشوں کے مقابلے میں اسکا کیا درجہ ہے، ابھی اسے چھوڑیئے لیکن یہ واضح ہے کہ بذات خود یہ ایک ایسی اصلی اور ناقابل انکار مفید شے ہے کہ اسکے حصول میں جسقدر بھی محنتیں اور دقتیں اٹھانا

پڑیں آسانی سے یہ اُن کا معاوضہ بن سکتا ہے۔

علم محض کسی مقصد تک رسائی کا ذریعہ یا کسی فن کی تمہید نہیں بلکہ خود منزل مقصود ہے۔ اور حاصل تحصیل بھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ حصول علم سے ہمیں اور اور فائدے بھی پہنچتے ہیں دوسرے بھی مستفید ہوتے ہیں مگر ان فوائد کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی اس کے حصول سے ہم اپنی فطرت کی ایک شدید حاجت کو دور کرتے ہماری فطرت دوسری ادنیٰ خلقت کیطرح معاً کمال پذیر نہیں ہوتی بلکہ اپنی تکمیل کیلئے بہت سی خارجی مدد کی محتاج ہے۔ علم ان میں سے ایک اصل شے ہے چاہے اس سے اور کوئی فائدہ نہ بھی اٹھایا جائے۔

سیسیرو[1] ذہنی کمالات کو گناتے ہوئے حصول علم برائے علم کو اولین جگہ دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ انسانی فطرت میں داخل ہے ہم حصول علم کیطرف کھنچے جاتے ہیں، اسمیں گوے سبقت لیجانا خوشی آیند ہوتا ہے۔ دوسری جانب غلطیاں کرنا، خطا کا مرتکب

---

[1] سیسیرو ایک بہت بڑا فلسفی اور رومیوں کا بہترین مقرر۔

ہونا، جاہل رہنا، فریب میں آجانا بُرا بھی ہے اور شرم آلود بھی - وہ
کہتا ہے کہ جب ہماری جسمانی ضروریات پوری ہوجاتی ہیں تو ہم
علم ہی کیطرف جھکتے ہیں، جب ہمارے حیوانی وجود کی خواہشات
اور فرائض (جو اپنی ذات، اپنے خاندان اور پڑوسیوں سے متعلق ہیں)
پوری ہوجاتی ہیں تو صداقت کی تلاش سامنے آتی ہے، اس لئے
جب ہم ضروریات اور افکار کے ہجوم سے فارغ ہوتے ہیں تو
ہماری خواہش ہوتی ہے کہ کچھ دیکھیں، سنیں اور سیکھیں، اور ہر
امر سربستہ کا انکشاف، عجیب و غریب چیزوں کا نظارہ ہی ہماری مسرت
کے ازدیاد کا باعث ہوتا ہے -

وہ چیزیں جو دوسری شے سے منقطع ہوکر بھی اپنا وجود قائم
رکھیں ضرور اپنے اندر جان رکھتی ہیں - وہ مشغلے جنکا کوئی خارجی نتیجہ
برآمد نہ ہو پھر بھی صدہا سال سے برقرار ہوں پسندیدہ گنے جاتے
ہوں گرچہ ابتک کارآمد نہ ثابت ہوئے ہوں ضرور خود اپنے آپ
میں کوئی غایت رکھتے ہیں چاہے وہ کچھ بھی ہو -

علم کی دو قسمیں ہیں - ایک تو وہ جسمیں دست و پا دخیل ہوں دماغ

کو برائے نام سروکار ہو یا سروکار ہی نہ ہو۔ دوسری قسم وہ ہے جسمیں محض عقل و دماغ ذہن و فکر کارفرما ہوں دست و پا معطل ہوں بعض علوم کارآمد اور نفع رساں ہیں، نفع رساں ہونیکا مفہوم یہ ہے کہ ایسے خارجی فائدے حاصل ہوں زر نقد ہاتھ آئے، لیکن بعض علوم ایسے ہیں کہ جن سے ہم صرف لطف اندوز ہوسکتے ہیں اور بس، وہ یوں کہ اُنسے کوئی خارجی نفع بصورت زر نقد حاصل نہیں ہوتا بلکہ اُنکا استعمال ہی انکا نتیجہ اور لطف کا حامل ہے اول الذکر کو نوکرانہ اور موخر الذکر کو لبرل کہتے ہیں

جب لبرل کا لفظ علم یا تعلیم کیساتھ آتا ہے تو اُسکا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے، اسکا وجود پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے مدتوں سے اس امر پر اختلاف چلا آتا ہے کہ کون کون سے مشغلے یا فن لبرل ہیں۔ لیکن یہ اختلاف انکی ہستی کو اور زیادہ ثابت کرتا ہے وہ خیال جو اتنے انقلابات کے بعد بھی قائم رہے ضرور اپنے اندر کوئی اصلیت رکھتا ہے۔

پھر اگر علم کو بذات خود مقصود یا لبرل یا شریف نکا علم کہا جائے یا اُسے یونیورسٹی کا موضوع قرار دیا جائے تو کوئی ناقابل فہم شے نہیں ہے۔ علم جسے فلسفہ بھی کہتے ہیں بالخصوص لبرل ہے وہ بذات خود

کافی ہے خارجی اور ظاہری غایات سے پاک۔
علم پر عقل کا تصرف ہوتا ہے تو وہ فلسفہ ہو جاتا ہے اور جب علم اس درجہ کو پہونچ جاتا ہے تو وہ ایک قوت بھی ہے یہ محض بذات خود مستحسن نہیں ہوتا بلکہ خارجی نتیجہ بھی رکھتا ہے لیکن کہنا یہ ہے کہ اس قوت کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی یہ ایک احسن شے ہے۔ یہ محض وسیلہ نہیں بلکہ مقصود بھی ہے، اس سے نفع رساں نتائج برآمد ہو سکتے ہیں لیکن جب علم عقل کے اقتدار میں آجاتا ہے تو فلسفہ بنجاتا ہے ایک علم کو ہم کارآمد دوسرے کو لبرل کہتے ہیں لیکن وہ شخص جو اسے ایک غرض کیلئے مصرف میں لاتا ہے دوسری غرض کیلئے استعمال نہیں کرتا ہے یا بہت کم کرتا ہے۔
اب تعلیم کے دو طریقے نکل آتے ہیں ایک کا رخ ہے فلسفہ کی طرف دوسرے کا افادہ کیطرف۔ ایک کل کیطرف جاتا ہے دوسرا جزو کیطرف، اس سے انکار نہیں کہ تفصیل یا عملی امور کیطرف دھیان دینا ضروریات سے ہے اور مفید بھی، زندگی میں ہم آئے دن عملی علوم کے محتاج ہیں، اور انکے بغیر چارہ ہی نہیں، ہم ان صاحبان کے ممنون ہیں جو ان علوم میں مشغول ہیں۔ کیونکہ ہم ان علوم کے محتاج ہیں لیکن بات یوں ہے کہ

علم جسقدر تفاصیل میں کھوجاتا ہے اسیقدر وہ علم کے صحیح معنوں سے

الگ ہوجاتا ہے یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ ایا جانور کیطرف علم کو منسوب

کیا جاسکتا ہے یا نہیں، وہ مجہول احساس یا چیزونکی پہچان جو جانورونکو

حاصل ہے شاید اسے علم کا درجہ دینا بیجا ہوگا۔ علم سے ہم ایک

ذہنی شے مراد لیتے ہیں وہ شے جو حواس کے محاصل پر متصرف

ہوسکتی ہو جو چیزونکے متعلق رائے قائم کرسکتی ہو جو حواس کے ذریعہ

محصولہ چیزونکے سوا بھی دیکھ سکتی ہو جسکو دیکھتی ہو اس پر غور و فکر

کرسکتی ہو، وہ شے جو خیال مہیا کرتی ہو اس علم کا اظہار محض دعویٰ

میں نہیں ہوتا ہے بلکہ دلیل میں ہوتا ہے یہ اپنے آغاز سے فلسفیانہ

ہوتا ہے اور یہی اسکا شرف ہے نتائج سے آنکھیں بند کرکے علم

کے شرف و مجد اور پسندیدگی کے اصول کا لحاظ ہی فلسفیانہ ہے۔

اسی سے یہ اپنی غایت آپ بنتا ہے اور لبرل کہلائے جانیکا مستحق

ہے، چیزونکے باہمی ربط کو نہ جاننا لڑکپن ہے یا غلامی، دنیا میں

ربط و نظام کا مشاہدہ ہی فلسفہ کا دعویٰ ہے یا کم ازکم اسکی آرزو۔

یہ علم کوئی خارجی یا اتفاقی شے نہیں ہے کہ آج ہمارا ہے تو کل

اُن کا یا آج کتابیں پڑھکر محفوظ کرلیا اور کل آسانی سے بھول گئے ۔
جیسا چاہا کیا جسکو چاہا دیا، ضرورت ہوئی تو کسی سے مانگ بھی لیا، بغل
میں دبائے پھرے اور بازار لیجاکر بیچ بھی ڈالا۔ نہیں یہ ایک حاصل کی
ہوئی روشنی ہے، یہ ایک عادت ہے، ایک شخصی ملکیت ہے اور ایک
باطنی عطیہ۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کو محض تعلیمگاہ نہیں کہکر "تربیت
کیجگہ" کہنا زیادہ صحیح ہے گرچہ جہانتک علم کا تعلق ہے تعلیم ہی کا لفظ
زیادہ موزوں ہے لیکن تربیت کا مفہوم اس سے اعلیٰ ہے اس سے
ذہنی فطرت کا اثر پذیر ہونا اور سیرت کی تعمیر کا اظہار ہوتا ہے۔
یہ ایک انفرادی اور مستقل شے ہے جب ہم حصول علم کا تذکرہ تربیت
کے مفہوم میں کرتے ہیں تو اس سے ہم یہ مراد رکھتے ہیں کہ علم ہماری
ذہنی کیفیت یا حالت کا نام ہے اور چونکہ ذہنی نشو و نما یقینی
بجائے خود قابل حصول چیز ہے پھر نتیجہ وہی نکلتا ہے جو لبرل یا
فلسفہ کے لفظ سے مستنبط ہوتا ہے یعنی ایک وہ علم بھی ہے جو
بجائے خود مرغوب اور بذات خود دولت ہے اور ہر سو نگی محنت
کا صلۂ وافر، چاہے اس سے کوئی خارجی نفع حاصل بھی نہ ہو۔

اب معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے علم کے حصول کی کوشش کا تو کچھ مفہوم سمجھ میں آتا ہے جسکا کوئی نہ کوئی نتیجہ علم کے سوا برآمد ہو لیکن اسکا کیا معنی کہ ہم علم محض علم کیلئے حاصل کریں، چاہے اس علم کے بارے میں انسان کا کچھ بھی خیال رہا ہو اور یہ خیال کتنی ہی سختی سے نہ قائم رہا ہو، پھر بھی یہ سمجھ سے باہر ہے، کوئی بھی علم ہو اس سے کوئی نہ کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور وہی اسکا مقصد ہے اور وہی مرغوب ہونیکا سبب، سوائے اسکے مقاصد دو طرح کے ہیں ایک دنیوی اور دوسرے دینی، جس علم کا مقصد دنیوی ہے وہ مفید ہے اور جسکا مقصد دینی ہے وہ مذہبی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر لبرل علم سے کوئی دنیوی فائدہ متصور نہیں ہو تو اس سے روحانی فائدے حاصل ہوتے ہیں یا اگر واقعہ یہ ہو کہ اس سے نہ تو دنیوی فائدے حاصل ہوں نہ دینی تو وہ ہر آئینہ شئے خیر نہیں۔ اور اس لائق نہیں کہ اسکے حصول کیلئے کوشش کی جائے۔

ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود اس لبرل یا فلسفیانہ علم کے حامیوں نے ہر زمانے میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے ہمیشہ

اب معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے علم کے حصول کی کوشش کا تو کچھ مفہوم سمجھ میں آتا ہے جسکا کوئی نہ کوئی نتیجہ علم کے سوا برآمد ہو لیکن اسکا کیا معنی کہ ہم علم محض علم کیلئے حاصل کریں، چاہے اس علم کے بارے میں انسان کا کچھ بھی خیال رہا ہو اور یہ خیال کتنی ہی سختی سے نہ قائم رہا ہو، پھر بھی یہ سمجھ سے باہر ہے، کوئی بھی علم ہو اس سے کوئی نہ کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور وہی اسکا مقصد ہے اور وہی مرغوب ہونیکا سبب، سوائے اسکے مقاصد دو طرح کے ہیں ایک دنیوی اور دوسرے دینی، جس علم کا مقصد دنیوی ہے وہ مفید ہے اور جسکا مقصد دینی ہے وہ مذہبی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر لبرل علم سے کوئی دنیوی فائدہ متصور نہیں ہو تو اس سے روحانی فائدے حاصل ہوتے ہیں یا اگر واقعہ یہ ہو کہ اس سے نہ تو دنیوی فائدے حاصل ہوں نہ دینی تو وہ ہر آئینہ شئے خیر نہیں۔ اور اس لائق نہیں کہ اسکے حصول کیلئے کوشش کی جائے۔

ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود اس لبرل یا فلسفیانہ علم کے حامیوں نے ہر زمانے میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے ہمیشہ

انکی کوشش یہی رہی کہ انسان نکوکار ہوں یاکم ازکم انہوں نے فرض
کرلیا ہے کہ ذہنی شائستگی کا نام نیکی ہے اور بنی نوع انسان میں
یہی فرقہ نیکوکاروں کا رہا ہے قول تو انکا یہ ہے لیکن فعل انکا ہمیشہ
قول کے خلاف رہا وہ اپنے عمل میں اسقدر گرے ہوئے رہ گئے کہ
خلقت میں انکی بدعملی ضرب المثل ہوگئی اور وہ باعث تمسخر و مضحکہ ہوکر
رہ گئے، کسیکو ضرر نہیں پہونچا لیکن انہوں نے ایسے وجوہات اور ذرائع
مہیا کردیئے کہ لوگ ان پر کھلے بندوں لے دے کرتے ہیں۔ خلاصہ
یہ ہے کہ اسوقت سے جبکہ خطہ یونان دنیا کی یونیورسٹی تھا فلسفہ نے
انسان کو کیا سکھایا ہے؟ یہی نا کہ وعدہ کرو ایفا نہ کرو، دعوی کرو
لیکن اسکی تکمیل نہ ہو۔ اسکے مریدونکے گہرے اور بلند خیالات کا ماحصل
بجز فصاحت بھرے الفاظ اور کیا برآمد ہوا ہے۔ یہی نا کہ جب
یونان انسانی تکالیف کو رفع کرنیکا بلند بانگ دعوی پیش کررہا تھا تو
اس سے ہمیں صرف یہی ملا کہ اس نے اپنے نصائح سے کسی شیریں نغمہ
کیطرح یا کسی ایسی تیز مگر بے خود کن عطر کیطرح جو پہلے اپنی خوشبو ہر طرف
پھیلا دے اور تھوڑی ہی دیر بعد اپنی خوشگواری کی مناسبت سے

ناخوشگوار ہو رہے ہیں میٹھی نیند سلا دیا تاکہ احساس ہی نہو، کیا فلسفہ نے سیسیرو کو غیر مستقل مزاج عوام کے خلاف کوئی مدد دی؟ کیا سینیکا[1] کو ظالم شہنشاہ کی مخالفت کی جرأت ہوئی؟ فلسفہ نے بروٹس کو عین وقت پر جیسا کہ بروٹس[2] نے اقبال کیا دغا دی، اور اس فلسفہ نے کیٹو[3] کو خدا سے بے زاری پر مجبور کیا جیسا کہ اسکے مداحوں کا لاف و گزاف ہے۔ اس فلسفہ کے حامیوں میں کتنے ہیں جو پولیمو[4] کی طرح اس فلسفہ کی بدولت راہ راست پر آئے، اینکساگورس[5] کیطرح اس فلسفہ کی خاطر دنیا سے ہاتھ دھو لینا اچھا سمجھا، راسیلاس[6] کے فلسفی نے ایک ایسے اصول کی تبلیغ کی جس

---

[1] سینیکا۔ فلسفی، مقرر اور اخلاقیات پر بہت سی کتابوں کا مصنف۔ [2] بروٹس، سیزر کی مخالفت سے الگ ہو کر سازش میں شریک ہوا جب اینٹونی سے شکست کھائی تو خودکشی کر لی [3] کیٹو۔ رومیوں کی ایک نامور ہستی جب سیزر کے مقابلے میں ناکامی ہوئی تو خودکشی کر لی۔ [4] پولیمو۔ ایک نوجوان یونانی سقراط کی تقریر سنکر اپنی بے راہ روی سے تائب ہوا اور آخر دم تک ثابت قدم رہا۔ [5] اینکساگورس، سقراط کا بھی استاد کو جیک ایشیا میں اچھی جائیداد رکھتا تھا سبھو چھوڑ کر کے اپنی زندگی فلسفہ اور غور و فکر کیلئے وقف کر دی [6] راسیلاس، ڈاکٹر جانسن کی تصنیفات سے ایک کتاب ہے اسمیں ایک حبشی شاہزادہ کو دنیاوی خوشی کی تلاش میں سرگرداں دکھایا گیا ہے۔

کاربند ہونا انسانی قوت سے بالا تھا اور آخر جب وہ انسانی محبت کی آزمائش میں پڑا تو بلا کسی جد و جہد کے شکست نصیب ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ضبط نفس پر اسکی بحثیں بڑی پر زور ہیں "اسکے بشرے سے عظمت ٹپکتی تھی انداز میں دل کشی تھی تلفظ صاف تھا اور طرز بیان پر تمکین ۔ اُسنے بڑے زور اور جوش کیساتھ کثرت سے مثالیں دیدیکر دکھایا کہ جب انسان خواہشات نفسانی کے تابع ہو جاتا ہے تو وہ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، انہوں نے نفس پر قابو پانیکی ترکیبیں بتائیں اور دکھایا کہ جنہوں نے نفس پر قابو پالیا وہ کیسے مسرت نصیب ہو گئے وہ امید کی فریب کاری اور خوف کی غلامی سے نجات پا گئے،، اس نے گن گن کر اُن بڑی ہستیوں کا نام لیا جنکی نگاہ ہو ئیں رنج و غم کی کوئی وقعت نہ تھی اور جنہوں نے آئے دن کے واقعات و حادثات سے جنہیں عوام اچھے اور بُرے الفاظ سے یاد کرتے ہیں آنکھیں پھیر لی تھیں ۔

راسیلاس نے چند ہی دن بعد اس فلسفی کو ایک نیم تاریک کمرے میں دیکھا آنکھیں پُر نم تھیں اور چہرہ زرد ، فلسفی نے کہا جناب آپ ایک ایسے وقت میں آئے ہیں کہ جب بڑی انسانی دوستیاں

بیکار ہیں مجھے جو دکھ ہے اسکی کوئی دوا نہیں۔ میری جو چیز کھو گئی ہے وہ اب مل ہی نہیں سکتی۔ میری بیٹی میری اکلوتی بیٹی گذشتہ رات بتلائے تپ ہو کر مر گئی شاہزادے نے کہا جناب یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے ایک دانشمند کو حیرت ہو، سب ہی جانتے ہیں کہ موت بہت قریب ہے ہمیں ہمیشہ موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ فلسفی نے کہا ہاں اے جوان آپکو آزار فرقت کا تجربہ ہی نہیں ہوا، راسیلاس نے کہا کیا آپ اپنا وعظ بھول گئے، وہ وعظ جو آپ بڑے زوروں سے کہا کرتے تھے کہ خارجی چیزیں فطرتاً متغیر ہیں۔ اس نے کہا صحیح ہے لیکن صداقت اور عقل ابھی میرے کس کام کی چیزیں ہیں ابھی مجھے اُنسے کیا مدد مل سکتی ہے بجز اسکے کہ میں سمجھوں کہ اب میری لڑکی مجھے واپس نہیں مل سکتی ہے۔

دوسرونکو مبتلائے فریب کرکے بہتر ہے کہ کوئی دعوی ہی نہ کیا جائے یہ نفس پرست یا دنیا دار کم از کم الفاظ کا پرستار نہیں ہے وہ ایک اصلی نفس الامری شے کا جویندہ ہے اور یا بندہ بھی فلسفہ افادیت نے بہرحال اپنا کام پورا کیا ہے۔ مانا کہ اسکا مقصد ادنی تھا لیکن اُسکے

بیکار ہیں مجھے جو دکھ ہے اسکی کوئی دوا نہیں۔ میری جو چیز کھو گئی ہے وہ اب مل ہی نہیں سکتی۔ میری بیٹی میری اکلوتی بیٹی گزشتہ رات بتلائے تپ ہو کر مر گئی شاہزادے نے کہا جناب یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے ایک دانشمند کو حیرت ہو، سب ہی جانتے ہیں کہ موت بہت قریب ہے ہمیں ہمیشہ موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ فلسفی نے کہا ہاں اے جوان آپکو آزار فرقت کا تجربہ ہی نہیں ہوا، راسیلاس نے کہا کیا آپ اپنا وعظ بھول گئے، وہ وعظ جو آپ بڑے زوروں سے کہا کرتے تھے کہ خارجی چیزیں فطرتاً متغیر ہیں۔ اس نے کہا صحیح ہے لیکن صداقت اور عقل ابھی میرے کس کام کی چیزیں ہیں ابھی مجھے انسے کیا مدد مل سکتی ہے بجز اسکے کہ میں سمجھوں کہ اب میری لڑکی مجھے واپس نہیں مل سکتی ہے۔

دوسروں کو مبتلائے فریب کر کے بہتر ہے کہ کوئی دعوی ہی نہ کیا جائے یہ نفس پرست یا دنیا دار کم از کم الفاظ کا پرستار نہیں ہے وہ ایک اصلی نفس الامری شے کا جویندہ ہے اور یا بندہ بھی فلسفہ افادیت نے بہرحال اپنا کام پورا کیا ہے۔ مانا کہ اسکا مقصد ادنی تھا لیکن اس

اپنے مقصد تک رسائی تو ہوئی ہے۔ لارڈ بیکن[1] جو فلسفہ افادیت
کے پیغمبر گذرے ہیں بعض حالات میں جھوٹے ٹھہرے تو اپنے فلسفہ سے
وہ اسکے پابند نہ تھے کہ اپنے دوستوں کیساتھ وفاداری برتیں یا اپنے
فرائض کی ادائیگی میں متدین رہیں، انکے پیغام میں حسن اخلاق کوئی
موضوع نہیں تھا اگر شاعر نے انہیں ذلیل ترین انسان کہا ہے تو
اس ذلت کا تعلق انکی خانگی حیثیت سے ہے۔ اس سے مسئلہ استخراج[2] کو
کوئی صدمہ نہیں پہونچتا ہے انکا کام تھا جسمانی مسرت اور تمدنی
آسائشوں کی ازدیاد اور وہ اپنی کوششوں میں تعجب اور حیرت ناک
حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں آئے دن انکے شجر علم میں تازہ
بتازہ شگوفے پھوٹتے ہیں برگ و بار آتے ہیں اور ہم انسے متمتع ہوتے
ہیں شاید ہی کوئی ایسا غریب شخص ہے کہ جسے اپنی روزانہ زندگی میں
انکے فلسفہ سے نفع اٹھانیکا موقع نہیں ملتا ہے۔ ہم انکے اس درجہ
رہین منت ہیں کہ انکی شان میں زیادہ درشت الفاظ استعمال نہیں کر سکتے۔
افسوس ہے کہ انسان اپنی عملی زندگی میں یا باطنی طور پر ٹھیک

---

[1] بیکن - ایک انگریز سیاست داں فلسفی اور مصنف، [2] اخراج، انڈکشن۔

ایسے ہی نیک، شریف اور متین نہیں پائے جاتے جیسے کہ وہ اکثر اپنی بیخودی میں یا معمور کیف حالتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ بکن بھی انہی ملحد فلسفیوں میں ہے جنہیں اپنے مخالف حالات میں گمراہ ہونیکا عذر گناہ حاصل ہو گیا ہے، افسوس ہے کہ سقراط اور سینیکا کیطرح اسکو بھی اسکے لباس فاخرہ سے جو اسقدر خوشنما ہو معرا کیا جائے اور بیکن اپنے پرشکوہ الفاظ کے سامنے ایک مضحکہ خیز ہستی ثابت ہو اپنی اعلیٰ قابلیت اور ادنیٰ اخلاق سے اپنے اسکول کی تنگ خیالی کا نمونہ نکلے۔ بہرحال ان باتوں کو مانتے ہوئے بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اعلیٰ سیرت اسکے فلسفہ کا جزو تھی۔ اس سے کسی حالت میں انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ اسنے دعویٰ کیا ہے اسمیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اس نے محض ایک طریقہ ایجاد کیا کہ جس سے اکثر لوگوں کی جسمانی تکالیف دور ہوں اور دنیوی ضرورتیں رفع ہوں اور اس کے قبل کہ اس طریقہ میں کسی نقصان کا اندیشہ ہو اسکے ذریعہ بکثرت متفرق اور مختلف صورتوں میں عطایاے فطرت ہمارے گھروں میں موجود ہو گئے ہیں اور اُسپر شاداں و فرحاں ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ نفع بخش علم نے اپنا فرض پورا کردیا ہے، اور وہ علم جسے لبرل کہتے ہیں ناکام رہا ہے لیکن یہ اُس حالت میں جبکہ ہم یہ بھی مان لیں کہ مذہبی علم کیطرح لبرل کا بھی براہ راست یہ مقصد ہے کہ انسان کو بہتر بنائے مگر ہم تو ایک لمحہ کیلئے بھی اسکے ماننے کو تیار نہیں اور جب تک ہم اسکو نہ مانیں معترضین کے اعتراض کی کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی ہم اس دعوی کی تائید کرتے ہیں کہ علم بذات خود مقصود ہے اپنی غایت آپ ہے، اسکے دوست اور اسکے دشمن جو کچھ بھی کہیں ہم یہی کہتے رہیں گے کہ اس علم کے دوش پر نیکی اور مذہبیت کا بوجھ ڈالنا اتنی ہی شدید غلطی ہے جتنی صنعت و حرفت کا انبار لادنا، اسکا اصلی موضوع اگر یہ ہو کہ بُری خواہشات کے مقابلے میں سپر کا کام دے یا تکالیف کی گھڑی راحت پہونچائے تو یہ بھی ہونا چاہئے کہ چرخہ چلانے اور گاڑی ہانکنے میں مدد دے، بالواسطہ اس سے چاہے جو فائدے بھی حاصل ہوں لیکن بذات خود اسکا موضوع نہ تو حصول سکون قلب ہے اور نہ دنیوی فارغ البالی۔

اب اگر اسکے مداح اس میں ایسی قوتوں کے ہونیکا دعوی کریں تو

انکا یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے کوئی علم معیشت کا واقف یہ دعویٰ کرے کہ اس علم نے اُسے ڈپلومیسی سکھادی ہے، علم ایک الگ شے ہے نیکی دوسری شے، فہم نیک اور شے ہے ضمیر اور شے، شائستگی کو خاکساری نہیں کہتے، نہ وسعت ولصفت نگاہ کا نام عقیدہ ہے فلسفہ چاہے کتنا ہی گہرا اور کتنا ہی با فروغ کیوں نہ ہو اس سے نفس پر قابو نہیں حاصل ہوسکتا ہے اور نہ اس سے جذبات مغلوب ہوتے ہیں، لبرل تعلیم سے نہ تو انسان دیندار ہوتا ہے نہ مذہب پرست۔ بلکہ شریف النفس بنتا ہے، شریف النفس ہونا دینی تربیت سے بہرہ ور ہونا اچھی چیزیں ہیں۔ زندگی کی روش میں مذاق کا لطیف رکھنا انصاف پسند بیدار مغز اور غیر جانبدار ہونا، شریف و با اخلاق ہونا خوش آیند ہیں اور یہ باتیں وسیع علم کی خصوصیات سے ہیں اور یہی یونیورسٹی کے مقاصد ہیں ہم یہی دعوی کرتے ہیں اور اسی پر زور ڈالتے ہیں لیکن پھر بھی ہم مکرر عرض کرینگے کہ یہ صفات امانت و دیانت کی ضامن نہیں ہیں، یہ صفتیں ایک دنیادار میں بھی پائی جاسکتی ہیں اور ایک آوارہ اور بدچلن بھی انکا اہل ہوسکتا ہے آہ! گرچہ وہ ان صفات سے

متصف بظاہر بھلا معلوم ہوتا ہے بادی النظر میں وہ اپنے اصلی روپ میں نہیں دکھائی دیتا دور سے وہ نیک معلوم ہوتا ہے لیکن آخر نگاہ غور پر قلعی کھل جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس پر ریا اور فریب کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن اسمیں انلوگوں کا بھی کوئی قصور نہیں بلکہ یہ انکے مرید اور مداح ہیں جو انہیں کچھ ایسی شخصیتیں بنا کر دکھاتے ہیں جو درحقیقت وہ نہیں ہوتے، انکے مداح ان کیلئے ایسی مدحت کے خواستگار ہوتے ہیں جسکا انہیں حق ہی نہیں پہونچتا، اگر سنگ خارا ایک استرے سے ریزہ ریزہ کیا جا سکتا ہو ایک جہاز ریشم کے تاگے میں بندھا جا سکتا ہو تو انسانی علم وعقل کے نازک اور تیز ہتھیار و لیسے انسانی کبر اور نفس امارہ کے دیو کا مقابلہ ممکن ہے، ورنہ ناممکن اور محال۔

یقینی ہم لبرل تعلیم کی قدر وقیمت کو نمایا کرنے کیلئے ایسے ایسے نظریوں کے اخذ پر مجبور نہیں ہیں، یقینی اسکے اصلی وجوہ جن پر اسکے دعویٰ کی بنیاد ہے ایسے دقیق ایسے مغلق ایسے عجیب ایسے بیرون قیاس نہیں ہیں، یقینی یہ ایسی بات ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

لبرل تعلیم بہ نفس خود ذہنی تربیت ہے اور اسکا مقصد ہے ذہنی

متصف بظاہر بھلا معلوم ہوتا ہے بادی النظر میں وہ اپنے اصلی روپ میں
نہیں دکھائی دیتا دور سے وہ نیک معلوم ہوتا ہے لیکن آخر نگاہ غور پر
قلعی کھل جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس پر ریا اور فریب کا الزام لگایا
جاتا ہے لیکن اسمیں انلوگوں کا بھی کوئی قصور نہیں بلکہ یہ انکے مرید اور
مداح ہیں جو انہیں کچھ ایسی شخصیتیں بنا کر دکھاتے ہیں جو درحقیقت وہ
نہیں ہوتے، انکے مداح ان کیلئے ایسی مدحت کے خواستگار ہوتے
ہیں جسکا انہیں حق ہی نہیں پہونچتا، اگر سنگ خارا ایک استرے
سے ریزہ ریزہ کیا جا سکتا ہو ایک جہاز ریشم کے تاگے میں بندھا
جا سکتا ہو تو انسانی علم و عقل کے نازک اور تیز ہتھیاروں سے انسانی کبر
اور نفس امارہ کے دیو کا مقابلہ ممکن ہے، ورنہ ناممکن اور محال۔
یقینی ہم لبرل تعلیم کی قدر و قیمت کو نمایا کرنے کیلئے ایسے ایسے
نظریوں کے اخذ پر مجبور نہیں ہیں، یقینی اسکے اصلی وجوہ جن پر اسکے
دعویٰ کی بنیاد ہے ایسے دقیق ایسے مغلق ایسے عجیب ایسے بیرون قیاس
نہیں ہیں، یقینی یہ ایسی بات ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجائے۔
لبرل تعلیم بہ نفس خود ذہنی تربیت ہے اور اسکا مقصد ہے ذہنی

کمال؛ ہر چیز کا ایک کمال ہے چاہے وہ شے اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ اور ایک شے کا کمال دوسرے کا نہیں ہوتا۔ چیزیں جاندار ہوں یا بیجان مشہور ہوں یا گمنام اپنی اپنی قسموں میں اچھی ہوتی ہیں لیکن انہیں میں کوئی ایسی ہوتی ہے جو اپنی قسم میں بہترین ہے اور اپنی جنس کا نمونہ ہوتی ہے۔ آپ کسی پھلواری یا کسی پارک کی خاطر کیوں اتنی محنتیں برداشت کرتے ہیں۔ آپکے شہر آپکے محل آپکے سرکاری مکانات آپکے ایوانات آپکے معبد سبھی خوبصورت ہیں اور انکی خوبصورتیوں کا کوئی خارجی نتیجہ نہیں، کوئی خوبصورتی جسمانی ہے تو کوئی اخلاقی۔ کوئی خوبصورتی چہرہ بشرہ کی ہے تو کوئی عادت واطوار کی، ٹھیک اسی طرح ایک ذہنی حسن اور ذہنی کمال بھی ہے ان سب حُسن وکمالات کا کوئی آئیڈیل اور نمونہ ہے جو سبھوں کا نصب العین ہے، یونانی اصنام قامت کی کشیدگی، کشادہ پیشانی اور متناسب اعضا کیساتھ جسمانی حُسن کے نمونہ ہیں تو سکندر، سیزر یا صلاح الدین جیسے صنادید فطرت انسانی کی عظمت کے آئیڈل ہیں، ایک مصور کے پیش نظر شکل و صورت کا حسن ہے اور ایک شاعر کے سامنے حسن خیال، ٹھیک اسی طرح

یں پھر یہ ہو لگا کہ ذہن کا بھی ایک حسن ہے اور یہ انہیں میسر ہوتا ہے
جو اسکے حصول کے درپے ہوتے ہیں، ذہن کی کشادگی، اس کی
تصحیح، اسکی شائستگی، ذہن کو اس قابل بنادینا کہ علم حاصل کرے،
اس پر غور کرے، اس پر حاوی ہوجائے اور اس کا استعمال کرسکے
یا اور دیگر کمالات سے ذہن کو مالامال کرنا ایک ایسا مقصد ہے جو
اسیطرح آسانی سے سمجھ میں آجائے جیسے نکوکار بننے کی کوشش
اگرچہ وہ ایک بالکل الگ شے ہے۔

گرچہ یہ ایک ناپائیدار شے اور زوال پذیر ملکیت ہے
لیکن اور اور چیزیں بھی تو ایسی ہیں جنکے پیچھے ہم پڑے ہوئے ہیں
ایک معلم اخلاق کہیگا کہ انسان اپنے سارے مشاغل میں ایک ایسا
پھول ہے جو کھلے اور مرجھائے، صرف وہ بلند اصول جو اسکے اعمال
میں جاری وساری ہوں اسکو حیات ابدی عطا کرسکتے ہیں، اگر
ذہنی قوتوں میں زوال آجاتا ہے تو جسمانی قوتیں بھی انسے پہلے
گھٹنے لگتی ہیں۔ اسلئے اگر ایک اسپتال جسکا نصب العین محض
ناپائدار شے ہے مذہبی نقطہ نگاہ سے مقدس ہے تو ایک

یونیورسٹی بھی مقدس ہو سکتی ہے چاہے وہ اس سے کچھ زیادہ نہ ہو جتنا میں نے کہا ہے، اگرچہ یہ دنیا فانی ہے پھر بھی ہم اسکے اچھے استعمال سے جنت نصیب ہو سکتے ہیں، ہماری فطرت کی تکمیل اسکی تخریب سے نہیں بلکہ فطرت میں اور بھی کچھ بڑھانے سے اور اعلیٰ مقاصد کیطرف اس کی عنان کو پھیرنے سے ہوتی ہے۔

# یونیورسٹی

یونیورسٹی دنیا کے سارے علوم کا اسکول ہوتا ہے، دنیا کے تمام حصص کے غریب الدیار کا ایک خاص مقام پر اجتماع، دنیا کے تمام حصص کا ـــــ ورنہ علم کی ہر شاخ کے اساتذہ کیونکر ملیں، متعلم کہاں سے آئیں وہ بھی ایک خاص جگہ میں؟ ورنہ "اسکول" کیونکر ہوا۔ اصلی صورت میں یہ ہر طرح کے علوم کا ایک اسکول ہے جہاں ہر گو شے کے اساتذہ اور طلبا پائے جائیں، اس تخیل کی تکمیل کیلئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، صحیح معنوں میں یونیورسٹی خیالات کی تبلیغ اور اشاعت

کی ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے یہ خیالات ذاتی تعارف کے ذریعہ سے
ساری دنیا میں پھیلیں ۔

یونیورسٹی کا یہ تخیل نہ بعید الفہم ہے اور نہ غیر معقول، اگر یونیورسٹی
یہی چیز ہے تو اس سے ہماری ایک فطری ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے۔
باہمی تربیت انسانی جماعت کا ایک ضروری مشغلہ ہے، کہیں تو یہ
بالارادہ عمل میں آتا ہے اور کہیں ارادہ کے بغیر، ایک نسل دوسری نسل
کی تشکیل کرتی ہے اور موجودہ نسل ہمیشہ اپنے منفرد ممبرونکی شخصیتوں پر
اثر انداز ہوتی ہے اس سلسلے میں کتابیں بڑی کارآمد ہیں، آجکل تو
خصوصاً۔ مطابع کی بڑھی ہوئی قوت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے
ہوئے کہ آئے دن یہ مطابع کیونکر رسالے 'ٹریکیٹ' پمفلٹ' تصانیف
اور ادبیات لطیف کے نامتناہی سلسلے کی اشاعت کرتے رہتے ہیں
ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ اگر حصول علم و آگاہی کے دوسرے ذرائع کے ترک کا
کوئی موزوں زمانہ ہوسکتا تھا تو وہ موزوں زمانہ یہی ہے، ہر قسم کے
علم کی ایسی مسلسل اور مختلف النوع ترویج و تبلیغ کے سوا انسانی ذہنی
تربیت کو اور کیا چاہئے یونان کی پیشینگو عورتوں نے اپنی پیشینگوئیاں

درختوں کے پتوں پر لکھ لکھ کر ضائع کر دیں لیکن اب ضائع ہونیکا ڈر نہیں رہا۔ جدید ایجادات نے انہیں پائداری دیدی ہے۔ اب پتھروں میں خطبے ہیں، بہتی ہوئی ندیوں میں کتابیں ہیں، ہر صبح ایسی ایسی تصانیف جو متقدمین کیلئے لافانی شہرت کی حامل ہو سکتی تھیں روزانہ سیکڑوں میل کی رفتار سے دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیل جاتی ہیں۔ ہماری نشستیں ہمارے چبوترے اُنسے بھر جاتے ہیں، ہماری دیواریں تک عقل سکھانے لگتی ہیں یہ ہمیں اشتہارات کے ذریعے آگاہ کرتی رہتی ہیں کہ ہم کہاں سے فوراً اور سستے داموں عقل خرید سکتے ہیں۔

ہمیں یہ سب باتیں تسلیم ہیں۔ تعلیم کے متعلق عوام میں یہی خیال ہے اور نتیجہ بھی قابل قدر ہے۔ لیکن پھر بھی جب کسی ایسی چیز کی جستجو ہوتی ہے جسے تجارتی زبان میں "بڑھیا مال" کہہ سکیں یا ایسی ہو جو نفیس ہو، پسندیدہ ہو، شائستہ ہو، عمدہ ہو تو آج بھی دوسرے بازار کا رُخ کرنا ضروری ہو جاتا ہے کیا نہ کسی شکل میں آج بھی وہی پُرانا دستور کام آتا ہے صحیح تعلیم کیلئے زبانی تلقین لابد ہو جاتی ہے، دو آدمیوں رُو در رُو گفت و شنید کی حاجت پڑجاتی ہے۔ محض علم نہیں بلکہ معلم سے بھی سر وکار

پڑتا ہے، شاگرد کو استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا ہوتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ علمی مراکز کا قیام عمل میں آتا ہے یہ وہ اصول ہے جو انسانی جماعت کے ہر شعبے میں دخیل ہے، چاہے وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو، ادبی ہو یا سائنسی۔

اگر انسان کا عمل اسکے عقائد کا آئینہ ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ کتابوں نے جو بیش قیمت فائدہ منصور ہے، وہ یہ ہے کہ کتابیں صداقت کے جریدہ دوام ہیں، مسئلہ متنازعہ فیہ میں حکم معلم کے ہاتھ میں آلہ تعلیم، کسی پیچیدہ اور مشکل علم میں کامل دستگاہ حاصل کرنے کیلئے ہمیں کسی جیتے جاگتے شخص کی ضرورت ہے۔ اور اسکی جیتی جاگتی تلقین کی۔ اسکا سبب کیا ہے؟ ہم اسکی تفتیش نہیں چاہتے امر واقعہ یہی ہے ممکن ہے ہم جو سبب بتائیں وہ کافی نہ ہو ورنہ یہی دیکھئے کہ کتابیں ان کل مسائل پر حاوی نہیں ہو سکتی ہیں جو پوچھے جا سکیں اور نہ ان مشکلات کو حل کر سکتی ہیں جو مختلف آدمیوں کو مختلف مواقع پر پیش آنا ممکن ہیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کتابیں ان نکات پر ان غوامض پر ایسی روشنی ڈال سکیں جو صرف ایک معلم اپنے الفاظ سے اپنے اعضا سے، انداز سے، اشارہ سے،

کنایہ سے بروقت موضوع پر ڈال سکتا ہے لیکن یہ ساری باتیں جو کہی گئیں فروعات سے ہیں، سب کچھ بھی ہو، جیسا کہا گیا ہے واقعہ یہی ہے، علم کی کسی شاخ کو لیجئے عام اصول تو گھر بیٹھ کر کتابوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن اسکی تفصیل اسکا رنگ اسکا لہجہ اسکی طرز اسکی وہ روح جو اس علم کو ہم میں زندہ رکھ سکے، یہ ساری چیزیں ہمیں وہیں میسر آئینگی جہاں وہ علم خود زندہ ہو، عقل سیکھنا ہو تو عقل کے معلم کے حضور میں حاضر ہونا ضروری ہے، تشنگی بجھانے کیلئے سرچشمہ تک پہنچنا لازمی، جُزو تو کتابوں کے ذریعے سے کہیں سے کہیں جاسکتا ہے لیکن کل صرف اپنے مرکز پر ہے۔ عقل کے یہی جامعے اور مرکز ہیں جہاں انسانی ذہانت کے شاہکار لکھے جاتے ہیں یا کم از کم ان کی ابتدا ہوتی ہے۔

یہ اصول جس پر اتنا زور دیا جارہا ہے اتنا بیّن ہے اور مثالیں اتنی پیش پا افتادہ ہیں کہ اب اس پر کچھ زیادہ کہنے سے بدمزگی سی ہو گی دو ایک مثالیں اور لیجئے۔

تہذیب و شائستگی کا حاصل کرنا آسان نہیں اور حاصل ہونے پر یہ چیزیں شخصی ہو جاتی ہیں، اگر یہ چیزیں حاصل کیجا سکتی ہیں تو جماعت میں رہکر

شریف بننے کیلئے بہتیری چیزیں درکار ہیں۔ روش ہے، لباس ہے، لب ولہجہ ہے، رفتار ہے گفتار ہے، بلند اخلاق ہے، علوئے خیال ہے، شیریں کلامی ہے شستگی مزاق ہے، کشادہ دلی ہے ان میں بعض تو فطری ہیں بعض کو نسب سے تعلق ہے بعض مزہبی ہیں لیکن کیا ممکن ہے کہ یہ چیزیں کتابیں پڑھ کر حاصل ہو جائیں یہ تو صرف اعلیٰ سوسائٹی سے حاصل ہو سکتی ہیں جہاں منفرد ہستیوں میں یہ صفتیں جمع رہتی ہیں جب تک کوئی فریق مقابل نہ ہو مقابلہ کیا ہو سکتا ہے جبتک کسی مسئلہ کی تائید نہ کیجئے نزاع کیونکر ہو، اسیطرح گفتگو سیکھنے کا امکان کیونکر پیدا ہو سکتا ہے، جب تک آپ کے سامنے دنیا گفتگو کرنے کیلئے موجود نہ ہو، اگر فطری شرمیلاپن دور کرنا ہو ناتراشیدگی اور ناشائستگی کو دفع کرنا ہو یا اور دوسرے نقص کا ازالہ مدنظر ہو تو حسن اخلاق کے اسکول میں داخلہ ضروری ہے اور وہ اسکول شہر ہیں یا کوئی دربار۔ یہی وہ مرکز ہیں جہاں دیہات کے لوگ خاص وقتوں میں انہیں تہذیب و شائستگی کی زیارتگاہیں سمجھ کر جاتے ہیں اور حسن اخلاق کی تکمیل کر کے گھروں کو لوٹتے ہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے تہذیب و شائستگی سیکھی جا سکتی ہے اور سیکھی جاتی ہے۔

اب مثالیں رہنے دیجئے، ہم پھر وہی کہتے ہیں کہ یونیورسٹی وہ جگہ ہے جہاں طلبہ ہر گوشہ ملک سے آتے ہیں اور ہر قسم کے علوم کے حصول کیلئے آتے ہیں، ہر ہر قسم کی بہترین چیز تو ہر ہر جگہ نہیں مل سکتی ہے اس کیلئے کسی شہر، کسی دارالسلطنت کا سفر ضروری ہے وہاں فطرت وصنعت کی بہترین پیداوار ایک خاص مقام میں مجتمع ہیں جو دوسری جگہوں میں منتشر ہوتی ہیں۔ دنیا کی ساری دولت زمین کی ساری نعمتیں وہاں پہنچتی ہیں، وہاں بہترین بازار ہیں اور بہترین دست کار، وہ تجارت کی منڈی ہے۔ فیشن کی عدالت العالیہ۔ نادر ونایاب چیزوں کا معیار اور حریف ذہانتوں میں حکم ........ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور اس بحر بے کراں کیلئے کوئی دوسرا سفینہ چاہئے

غرض یونیورسٹی اپنے تخیل اور مقصد میں یہی ہے اور واقعتاً پہلے بھی رہی ہے۔

# شریف النفس

شریف النفس کی تعریف یہ ہے کہ وہ کسی کے در پئے آزار نہو۔ یہ تعریف کسی حد تک واضح بھی ہے اور مکمل بھی، شریف النفس کا کام یہ ہے کہ دوسرو نکی راہ سے رُکاوٹوں کو دور کرے دوسرو نکی تحریک سے اتفاق کرنا خود محرک بننے سے بہتر جانے، ہم اُسے ایک آرام کرسی یا آتشدان سے تشبیہ دیسکتے ہیں۔ فطرت تکان دور کرنے یا سردی دفع کرنے میں ان چیزو نکی محتاج نہیں لیکن تھکے ہوئے سے پوچھو ٹھٹھرے ہوئے سے دریافت کرو کہ آرام کرسی یا آتشدان کے کیا فائدے ہیں؟ ایسے ہی فوائد ہیں جو خاص خاص افراد کو ایک شریف النفس ہستی سے نصیب ہوتے ہیں

ایک شخص جو صحیح معنوں میں شریف النفس ہو ہمیشہ ایسے فعل کے ارتکاب سے باز رہیگا جس سے کسی کے دل پر چوٹ لگے یا صدمہ پہنچے وہ اختلاف رائے۔ تصادم احساسات سوء ظن اور ملال و ناراضگی

سے ہمیشہ الگ رہنے کی کوشش کرے گا اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوگی کہ ہر شخص اُسے اپنا ہمدرد دوست سمجھے۔

شریف النفس کسی سے آنکھیں نہیں پھیر لیتا اگر شرمیلے کیساتھ محبت سے پیش آتا ہے تو بیگانے کیساتھ مروت کا برتاؤ کرتا ہے کم فہموں پر رحم کرتا ہے اور جس سے مخاطب ہوتا ہے اسے پہچانتا ہے باتیں کرنے میں وہ کبھی ایسے غیر معقول واقعات یا مبحث کا حوالہ نہیں دیتا جس سے مخاطب کو ملال ہو گفتگو میں کبھی نمایاں حصہ نہیں لیتا اور نہ ایسی باتیں کرتا ہے جو گراں گذریں، اپنے غیطوں کو دقیع نہیں سمجھتا اگر کسیکو کچھ دیتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لے رہا ہے اپنا تذکرہ کبھی نہیں کرتا اگر کرتا ہے تو مجبوراً، تلخ جواب سے وہ حریف کو چپ نہیں کرنا چاہتا نہ بُری بھلی باتوں پر کان دھرتا ہے سوء ظن سے دور رہتا ہے اور سب کیطرف سے حسن ظن قائم رکھتا ہے آپس کے جھگڑوں میں وہ حریف کی کمزوری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا دلائل و براہین کے بدلے ذاتیات پر حملے نہیں کرتا جس بات کو کھلے طور پر نہ کہہ سکے اس کیطرف اشارہ کنایہ سے کام نہیں لیتا دشمنوں کے ساتھ حکمائے قدیم

کے اس اصول پر سختی سے کاربند رہتا ہے کہ " باشد کہ روزے دوست گردد" بغض و حسد کی طرف سے تغافل برتتا ہے اپنی توہین سے ناراض نہیں ہوتا، کسی نے ضرر پہونچایا ہو تو اس کے یاد رکھنے کی اُسے فرصت نہیں ہوتی۔

وہ فلسفیانہ طور پر بردبار اور حلیم ہوتا ہے۔ مصائب کو اٹل جدائیوں کو مرض لاعلاج اور اموات کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر برداشت کرتا ہے، کسی سے مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا تربیت یافتہ دماغ اُسے کج خلقی سے باز رکھتا ہے، وہ بھدے ہتھیار کی طرح چیرنا پھاڑنا نہیں جانتا بلکہ تیز دھار ہتھیار کی طرح کام کرتا ہے، وہ مجبث سے الگ نہیں ہوتا اور نہ مبحث کو الجھا ہوا چھوڑتا ہے وہ اپنی رائے میں غلط ہو یا صحیح مگر بے انصاف نہیں ہوتا اسکی بحث سادہ ہوتی ہے مگر قوی، مختصر ہوتی ہے مگر جامع، رواداری غور و تفکر اور صاف باطنی کا ثبوت اس سے بہتر کوئی نہیں دے سکتا، وہ اپنے حریف کو دھوکا نہیں دیتا بلکہ اپنی غلطیوں کی توجیہ کرتا ہے۔ وہ عقل انسانی کی کوتاہیوں سے بھی واقف

ہوتا ہے اور اس کے کمالات کو بھی جانتا ہے، وہ اسکے موقع و محل کو بھی پہچانتا ہے اور اس کے حدود سے بھی آگاہی رکھتا ہے۔

ممکن ہے وہ ملحد ہو مگر اسکی نیچر اور وسیع النظری کسی مذہب کی توہین گوارہ نہیں کرتی، وہ مذہبی مجالس کی قدر کرتا ہے اور اراکین مذہب کی عزت، مذہبی رسومات سے اسے اختلاف ہو تو ہو مگر اسے الحاد کا جنون نہیں ہوتا، وہ مذہبی رواداری کو دل سے پسند کرتا ہے اور یہ باتیں محض اسلئے نہیں کہ اسکا فلسفہ اسے ان پر مجبور کرتا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ "تلطف و مدارا" تہذیب کی خصوصیات سے ہیں،

# یونیورسٹی (جامعہ) کی فیضانات

یونیورسٹی کا اگر کوئی عملی مقصد پیش نظر ہے تو وہ جماعت کیلئے اچھے افراد کی تربیت ہے، اس کی غایت یہی ہے کہ اُسکے تعلیم یافتوں میں دنیوی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے متمدن زندگی اس کا موضوع ہے اس میں نہ تو کسی خاص شئے کی

تعلیم ہوتی ہے نہ اس سے بڑے بڑے صنادید ہی نکلتے ہیں ۔ کسی
غیر معمولی ذہین کی تخلیق بھی اس کا مقصد نہیں ۔ یونیورسٹی بڑے بڑے
شاعر بڑے بڑے مصنفین نامور بانیان اسکول مشہور فاتحان ملک
کی بھی مولد نہیں ۔ یونیورسٹی یہ نہیں کہتی ہے کہ ہم تمہیں ارسطو، نیوٹن،
نیپولین، واشنگٹن، شیکسپیر کے پایہ کے فرزندان مہیا کر دیں گے
گرچہ فطرت کے یہ اعجاز قبل ازیں اس کی آغوش میں پرورش
پاچکے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم ایک معمولی مگر عظیم مقصد
کے حصول کا ایک معمولی مگر عظیم ذریعہ ہے ؛ اس سے جماعت کا
ذہنی لہجہ بلند ہوتا ہے اس سے ذہنیت عامہ کی تربیت ہوتی ہے
قومی مذاق میں پاکیزگی آتی ہے، عوام کے ولولوں کو ایک صحیح اصول
میسر ہوتا ہے، عوام کے میلانات ایک معین مقصد کیطرف پھرتے ہیں
عصری خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے، سیاسی قوتوں کے استعمال
میں آسانی ہوتی ہے، خانگی زندگیوں میں شائستگی آتی ہے، یہی وہ
تعلیم ہے جس سے اپنے خیالات اور اپنے فیصلے کے متعلق انسان
کے ضمیر میں اطمینان پیدا ہوتا ہے، اور وہ راستی کیساتھ آگے

بڑھتا ہے فصاحت کے ساتھ ان کا اظہار کرتا ہے اور زوروں کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اس تعلیم سے انسان چیزوں کو ان کی اصلی حیثیت میں دیکھتا ہے، آسانی سے موضوع بحث تک جا پہونچتا ہے، لغویات کو الگ چھانٹ دیتا ہے، اور غیر متعلقات سے قطع نظر کر لیتا ہے، یونیورسٹی کی تعلیم سے انسان کسی عہدے کو امتیاز کے ساتھ پُر کر سکتا ہے اور کسی موضوع پر بآسانی حاوی ہوسکتا ہے۔ اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسروں میں کیوں کر گزارہ کرے۔ دوسروں کے حالات کا کیوں کر احساس کرے، اپنے خیالات دوسروں کے سامنے کیوں کر لائے، دوسروں کو کیوں کر متاثر کرے، دوسروں سے کیونکر سمجھوتہ کرے دوسروں سے کیونکر برتاؤ کرے، کسی مجلس میں بھی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ بیگانہ نہیں ہوتا اسے سبھوں سے اشتراک عمل ہوتا ہے، وہ وقت گفتن و وقت خاموشی کا پاسدار ہوتا ہے، وہ باتیں کر بھی سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے، وہ برمحل سوال بھی کر سکتا ہے اور سبق بھی حاصل

کر سکتا ہے، وہ ہمیشہ مستعد رہتا ہے لیکن بیجا دخل انداز
نہیں ہوتا وہ ایک یار شاطر ہوتا ہے اور قابل اعتماد رفیق،
اس میں متانت بھی ہے اور ظرافت بھی، اس کی ظرافت
خوشگوار ہوتی ہے اور اس کی متانت مؤثر۔ اس کا دل پرسکون
ہوتا ہے اور وہ ایک ایسا سکون ہے کہ اس کی بنیاد محض خارجی
اثرات پر قائم نہیں ہے بلکہ بذات خود مستقل ہے۔ یونیورسٹی
کے تعلیم یافتہ کو ایک ایسی نعمت حاصل ہے جو جلوت میں بھی
کام آتی ہے اور خلوت میں بھی۔ جس کے بغیر اقبال مندی
ناخوشگوار اور جس کے ہوتے ہوئے ناکامیاں اور دل
شکستگیاں مرغوب ہیں۔ یہی وہ آرٹ جو انسان کے لئے
اتنے منافع رکھتا ہے یونیورسٹی کا موضوع ہے۔ اور دولت
وصحت کے حصول کی طرح یونیورسٹی اس کے لئے کوشاں
ہے گرچہ نتیجہ اتنا یقینی اور اس قدر ٹھوس نہیں۔

# لٹریچر
## یا
# ادبیات

لٹریچر کی متفرق قسمیں ہیں مثلاً قدیم لٹریچر۔ جدید لٹریچر، مذہبی لٹریچر اور ادبیات لطیف، مگر یہ درست نہیں کہ ہم ہر ایک تحریر کو لٹریچر میں شمار کریں، یہ درست ہو تو ہمیں فلسفہ اور قانون کو بھی لٹریچر ہی ماننا پڑے گا کیا ہر ایک تصنیف لٹریچر ہے؟ کیا ہر وہ کتاب جس کی طرزِ تحریر پر خاص توجہ دی گئی ہو لٹریچر کی حامل ہے۔ کیا لٹریچر نام ہے تحریر کی رنگین ہونے کا؟ یا لٹریچر ایسی تصنیف ہے جو صنایع بدایع پر مشتمل ہو؟

اگر کسی کا خیال ایسا ہی ہو تو لائق صد ستائش لیکن

ہم لٹریچر کو الفاظ کی زرگری نہیں سمجھتے۔ گوناگونی رنگا رنگی اور وسعت اشاعت کو مدنظر رکھتے ہوئے لٹریچر تحریر پر مبنی ہے نہ کہ تقریر پر، خود لفظ لٹریچر بھی اس پر دال ہے تقریر کی رسائی مقرر کی بلندی آواز سے اونچی نہیں جب مقصد یہ ہو کہ الفاظ سے خیالات کے ایک طویل سلسلہ کا اظہار ہو یا وہ خیالات دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچ جائیں یا یہ کہ انہیں دوام حاصل ہو تو سیہ در سفید لازمی ہے۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ ہم اپنی تحریروں میں اپنے قارئین کو بھی سامعین ہی سمجھتے ہیں اور بصارت سے زیادہ سماعت کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہ قوت گویائی ہے، بولی ہے یا استعمال زبان جب ہم لکھنے میں مشغول ہوتے ہیں اس وقت بھی ہمیں اسکا خیال رہتا ہے کہ ہمارے اظہار خیال کا اصلی ذریعہ تقریر ہے نہ کہ تحریر اور یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تحریر میں

ان الفاظ کے استعمال سے نہیں جھجکتے جو محض تقریر
کے لئے موزوں ہیں۔
پس تحریر یا لٹریچر جو تقریر کا ایک جریدۂ دوام
ہے درحقیقت ایک ذاتی اور شخصی چیز ہے۔ یہ ایسی
چیز نہیں جو دو چار آدمیوں کی شرکت کی متحمل ہو، اس
کی ہستی کسی مشین کی زیر بار احسان نہیں۔ اس کو کسی
خاص فرد سے نسبت ہوتی ہے اور ہونا چاہئے، ایک
ہی تقریر جو بالکل ایک ہی ہو دو مقرر نہیں کر سکتے۔
ایک ہی مقالہ جو بالکل ایک ہی ہو دو آدمی نہیں لکھ سکتے
ہر شخص کے خیالات و احساسات ذاتی ہوتے ہیں۔
ممکن ہے دوسرے بھی ایسے ہی خیالات و احساسات
کے مالک ہوں لیکن ہر ایک کے خیالات و احساسات
میں ایک امتیازی خصوصیت ضرور ہوتی ہے، جس طرح
ہر شخص کی آواز میں، طرز گفتگو میں، چہرہ بشرہ میں، حرکات
و سکنات میں ایک امتیازی خصوصیت ہوتی ہی دوسر

لفظوں میں یہ کہیے کہ لٹریچر کسی خارجی حقیقت کا اظہار
نہیں ہے بلکہ داخلی کا اظہار ہے اور لٹریچر کسی
بیرونی شے کا بیان نہیں ہے بلکہ "شرح درد پنہاں" ہے۔
واضح ہو گیا کہ لٹریچر زبان کا شخصی یا ذاتی استعمال
ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مصنف ایک ہی لفظ کو
الگ الگ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ بات یہ ہے
کہ زبان کی ابتدا ابھی بڑی حد تک خاص خاص افراد کی
زیر بار منت ہے۔ اکثر فقروں اور ضرب الامثال کو
خاص افراد سے نسبت ہے۔ کسی زبان کے اکثر الفاظ
اس قوم کے جذبات و عادات کے آئینہ ہوتے ہیں،
بعض اشخاص زبان کا استعمال اسی طرح کرتے ہیں
جس طرح اُسے پاتے ہیں لیکن ایک غیر معمولی ذہنیت کا
آدمی زبان کو اپنے مقصد کا تابع کر لیتا ہے اور زبان
اس کی خصوصیت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے وہ اپنے
خیالات، احساسات، تفکرات، تصورات اور تمناؤں کے

ہجوم اور تسلسل کا جو اس کے دل میں گذرتے ہیں، اپنے اخذ و ربط توازن و تفریق کی قوتوں کا جنہیں انکی شخصیت سے خاص لگاؤ ہوتا ہے اور بیرونی اشیا کے متعلق اپنی رائے کا، زندگی، اخلاق اور تاریخ کے متعلق اپنے فیصلے کا، حاضر جوابی، ظرافت، متانت اور فطانت کی قوتوں کے استعمال کا، یہ اور بیشمار و غیر منقطع تخلیقیں اور خود اپنی قوت متخیلہ کی دھڑکن پھڑکن کا الفاظ میں مرقع پیش کرتا ہے اور انکی تحریر گویا انکی پر جوش شخصیت کا ایک عکس ہوتی ہے جسطرح ایک شخص کا سایہ دوسرے کے سائے سے جدا گانہ ہوا کرتا ہے ٹھیک اسی طرح ایک شخص کی طرز تحریر دوسرے کی طرز تحریر سے الگ ہوتی ہے۔

الفاظ و خیالات ناقابل افتراق چیزیں ہیں۔ طرز تحریر خیالات کا ہو بہو نقشہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ لٹریچر نہ تو محض چیزیں یا چیزوں کے لفظی علامات ہیں اور نہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں بلکہ وہ خیالات ہیں جو الفاظ میں ادا کئے گئے ہوں، اگر نور سے چمک زندگی سے حرکت کا افتراق یا کسی خم کی گنبدی اور قوسی اطراف میں انفصال ممکن ہے تو خیالات کا

بھی الفاظ سے بینیاز ہونا قرین قیاس ہے لیکن جبتک یہ ناممکن ہیں قوت متخیلہ کا اپنے
عکس یعنی الفاظ کو ایکقدم بھی پیچھے چھوڑنا خارج از وہم وگمان ہے۔
بعض اصحاب خیالات والفاظ کو دو چیزیں سمجھتے ہیں، انکے خیال
میں تحریر کی رنگینی ایک خارجی شے ہے جو زیب و زینت کیلئے کام میں لائی
گئی ہو اور وہی ایسی رنگینی سے کام لیتے ہیں جنہیں وقت ملے اور میلان
طبیعت بھی رکھتے ہوں، گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص خیال سے کام لے سکتا
ہے اور دوسرا تحریر اور طرز تحریر سے، فارسی کی کتابوں میں ایسے نوجوانوں کا
بیان ہے جنہیں سفر مشرق میں خط وکتابت کا موقع پیش آتا ہے انہیں
ایک جملہ بھی لکھنا نہیں آتا وہ پیشہ ور کاتب کے پاس جاتے ہیں اُس پر اپنے
مطلب جتا ہے وہ کسی سے کسی چیز کی طلبگاری ہو یا کسی حسین وجمیل خاتون
کی خواستگاری ہو ظاہر کرتے ہیں بہرحال وہ پیشہ ور کاتب ٹھیک ایک
کاغذ بیچنے والے کیطرح یا اُس استاد کیطرح جو اپنے شاگرد کے قلم میں قط
لگادے حسب ضرورت ان کیلئے الفاظ تیار کر دیتا ہے، ان کیلئے الفاظ
وخیالات دو چیزیں ہیں اور اسیلئے یہ تقسیم عمل ہے، اہل خیال اہل الفاظ
کیخدمت میں حاضر ہوتا ہے اور اہل الفاظ ان خیالات سے بہرہ ور ہو کر

خامۂ تمنا کو مداد التجا میں ڈبو کر صفحۂ آہ و فغاں پر رواں کرتا ہے۔
پھر بلبل محبت گل حسن پر چہچہاتی ہے اور نسیم اضطراب جبین انتظار سے
اٹکھیلیاں کرتی ہے۔ یہ ہے وہ لٹریچر جسے مشرقی رنگین لٹریچر یا ادبیات
لطیف کہتے ہیں حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ لٹریچر
میں حسن الفاظ کا دخل محض اس لئے ہے کہ حسن خیال اسی کی
شایان ہے یہ وہ آگ ہے جو مصنف کے سینے میں سلگتی ہے
اور دہکتی ہوئی اور ناقابل سدباب فصاحت کے تیز دھارے
کیصورت میں اُبل پڑتی ہے۔ ایک فطری شعریت ہے جو غزل یا
قصیدے کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

جب ایک مصنف کے خیالات و دلائل شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں
تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی طرز تحریر محض اسکے موضوع کا آئینہ
نہیں بلکہ اسکی پوری شخصیت کا آئینہ ہو، شوکت الفاظ، الفاظ کی
بندش، الفاظ کا انتخاب جو بادی النظر میں بالائی شے ہیں درحقیقت
علوے دماغ کی ایک عادت اور روش کے کرشمے ہیں، ایک عالی دماغ کے
الفاظ محض اسکے بلند خیالات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اسکی عالی شخصیت کا بھی

اظہار کرتے ہیں الفاظ کا پنساری بلا لحاظ موضوع حسب فرمائش الفاظ مہیا کرتا ہے، وہ ایسا زرگر یا رنگریز ہے کہ جسے چاہے اُسے زرین کردے یا حسب خواہش رنگ دے، لیکن ایک مسلم الثبوت صانع یعنی ارٹسٹ کے سامنے ایک اعلیٰ تخیل یا نصب العین ہوتا ہے اور اسکا ایک اور محض ایک مقصد ہوتا ہے یعنی موضوع سخن کو اپنے احساسات وخیالات اور اپنی شخصیت کے موزوں اثرات سے نمایاں کرنا۔

المختصر لٹریچر خیالات کا اظہار ہے الفاظ میں، خیالات سے ہم احساسات، آرار، دلائل اور دیگر افعال جو انسانی دماغ سے متعلق ہیں مراد لیتے ہیں۔ اور فن تحریر ایک ذریعہ ہے جس سے ایک مقرر یا مصنف اپنے موضوع کی شایان شان اور اپنے سامعین یا قارئین کیلئے کافی الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اور متاثر بھی لٹریچر ایک شخصی چیز ہے جو ان حضرات کی تعلیم اور اصولوں پر مشتمل ہے جنہیں اپنی جنس کیطرف سے بولنے کا حق ہے اور جن کے الفاظ میں ان کے برادران اپنے جذبات اور اپنی سرگذشت کی ترجمانی پاتے ہیں۔ ایک عالی پایہ مصنف ہم اسے نہیں کہتے جو محض الفاظ کا دھنی ہی

اور نظم و نثر میں نہایت آسانی کے ساتھ گرما گرم فقرے جڑ
سکتا ہے، یا رنگین جملے لکھ سکتا ہے، بلکہ وہ شخص جسے کہنا
آتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ "سخنہائے گفتنی" بھی رکھتا
ایک بلند پایہ مصنف اور عالی دماغ ادیب ہے۔
اگر نطق کی قوت ایک نعمت عظمیٰ ہے، اگر الفاظ میں راز دل
کا اظہار ہے، درد نہاں آشکار ہے، عقل کو ثبات ہے، ال
سے تجربے کے دفتر تیار ہوتے ہیں الفاظ کے ذریعے
حاصل یکجائی ہیں نصائح کے باب کھلتے ہیں۔ اگر بلند پایہ مصنفین
کے طفیل اختلاف میں اتفاق پیدا ہوتا ہے، قومی سیرت کی بنیاد
پڑتی ہے، ایک قوم اپنی ماضی و مستقبل کو پڑھتی ہے، مشرق و مغر
میں یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر ایسے حضرات نوع انسان کے
حق میں نمائندہ کی حیثیت اور پیغمبر کا درجہ رکھتے ہیں تو لٹریچ
کی طرف سے تغافل برتنا یا لٹریچر کی تحقیر کرنا زیبا نہیں بلکہ
اس کے حصول سے علیٰ قدر مراتب ہم خود بھی مستفید ہو سکے
ہیں اور ابنائے جنس کے لئے بھی مفید بن سکتے ہیں۔

تحریک فیضان لوح و قلم جگناتھ پور آباد پور بارسوئی کٹیہار بہار